ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم

رومی کا انسان

مسلمان مفکرین بعد صوفیہ کے ہاں انسان کا جو تصور ملتا ہے وہ براہِ راست یا بالواسطہ قرآن کریم کے نظریۂ آدم کی تفسیر ہوتی ہے۔ جلال الدین رومی کا نصب العینی آدم ہو یا عبدالکریم جیلی کا انسانِ کامل، یا اقبال کا مردِ مومن، سب اسی آدمِ صفی کی تصویریں ہیں جسے قرآن نے مسجودِ ملائک، مسخرِ کائنات اور خلیفۃ اللہ فی الارض قرار دیا۔ اگر توحیدِ خالص کے عقیدے کے علاوہ اسلام میں اہم امتیازی خصوصیت یا انقلابی تعلیم ڈھونڈنا چاہیں تو وہ تکریمِ انسان کی تعلیم ہے۔ اسلام حقیقت میں تکریمِ آدم کا مذہب ہے۔ مادیت اور روحانیت کے جتنے مذاہب اسلام کے معاصر تھے، جو اس سے قبل وجود میں آئے تھے، قریباً سب کے اندر انسان بے حیثیت ہو گیا تھا۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو کے فلسفے میں خدا کا تصور ایک منطقی عقلِ کُل کا تصور تھا۔ افراد اور اشیا کی حقیقت محض ظلی اور اعتباری تھی۔ عقلِ کُل کے ایک بے ارادہ بے مقصود سرمدی ڈھانچے کے سوا نہ کائنات کی کچھ حقیقت تھی اور نہ انسان کی۔ افراد و اشیا عقلِ بے پایاں کے قلزمِ ناپیدا کنار کی لہریں تھیں۔ ہندوستان میں مذہبی تفکر کا ارتقا اس منزل پر جا پہنچا تھا جہاں کائنات کا وجود اور انسان کی صورت اور اس کی انفرادیت فریبِ ادراک کا نتیجہ تھی۔ اخلاقی اور فطری قوانین سب نمودِ بے بود یعنی مایا تھے اور انسان کی زندگی کا یہ مقصود قرار دیا گیا تھا کہ وہ اپنی بے حقیقتی اور عدمِ محض ہونے کو پہچان لے۔ اسی کا نام گیان اور عرفان تھا۔ مغرب میں مذہب کا یہ عقیدہ استوار ہو گیا تھا کہ آدم جنت میں ایک شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے کی سزا میں مردود ہو گیا۔ شیطان نے حوا کو بہکایا اور بیوی نے میاں کو ورغلایا اور پھسلایا، دونوں مردود اور مطرود ہو کر جنت سے نکال دیے گئے اور یہ جرم اتنا شدید اور ناقابلِ عفو تھا کہ ابدالآباد تک ان کی لامتناہی پشتوں میں جو کوئی بھی پیدا ہو گا وہ ناکردہ گناہ، عصیان کی آلودگی ورثے میں لے کر معرضِ وجود میں آئے گا۔ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آلودگی کی وجہ سے فطرتاً اعمالِ صالحہ اس کے لیے دشوار بلکہ ناممکن ہوں گے اور کسی فکرِ صالح یا حیاتِ طیبہ کی کوشش سے اس کی نجات نہ ہو سکے گی، جب تک وہ ایک ناقابلِ فہم اور ناقابلِ یقین عقائد کو اندھا دھند تسلیم کر کے اپنا چھٹکارا نہ کرا لے یا جب تک خدا کسی برگزیدہ ہستی کو بے گناہ بھینٹ بنا کر کفارے کی صورت نہ پیدا کر دے۔

ان تمام نظریات اور عقائد کے مقابل میں قرآن نے یہ تعلیم دی کہ خدا کی نافرمانی کا میلان انسان کے صاحبِ اختیار ہستی ہونے کی وجہ سے اس میں پایا جاتا ہے لیکن گناہ سے تائب ہونے اور اپنی زندگی کا بگڑا ہوا توازن پھر سے درست کر لینے کی صلاحیت بھی اس میں موجود ہے۔ انسان احساس گناہ اور عملِ توبہ کے بعد اسفل السافلین سے ابھر کر احسن تقویم کی مسند پر بیٹھ سکتا اور اس قابل بن سکتا ہے کہ ملائکہ یا کائنات میں کارفرما صالحہ قوتیں اس کے سامنے سربسجود ہو جائیں اور وہ اس لیے کہ اس کو خلافتِ الٰہیہ کا منصبِ عالی عطا ہوا ہے۔ ایسا انسان خدا کی ذات اور صفات سے اتنا قریب ہوتا ہے کہ اس قرب کو کسی مکانی اصطلاح میں ادا نہیں کر سکتے۔

نحن اقرب الیہ من حبل الورید۔ شہ رگ سے بھی زیادہ قرب، قربِ مکانی نہیں بلکہ قربِ جانی ہے جس کے بیان میں زبان عاجز ہے۔

مولانا روم کے ہاں انسان کا یہی تصور ہے۔ اس قرب کے متعلق مولانا فرماتے ہیں کہ یہ قربِ مکانی نہیں۔ کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ انسان کی عقل کا اس کے جسم سے کس قسم کا رابطہ ہے۔ کیا وہ عقل جو کائنات کے حقائق کا اندازہ لگاتی ہے اور کائنات کو حیطۂ ادراک میں لاتی ہے اس کے متعلق یہ کہنا جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اس دو گز جسم کے اندر محدود ہے۔ یہ تعلق بے چون ہے یعنی اس کی کیفیت کو مکانی اور منطقی اصطلاحوں میں بیان نہیں کر سکتے۔ یہ اتصال ایسا ہے کہ قیاس میں نہیں آ سکتا۔ انسان جب فصل اور وصل، جوڑ اور توڑ کا تصور کرتا ہے تو لازماً مکانیت کے نقطۂ نظر سے کرتا ہے۔ آنکھ میں قوتِ باصرہ، ناک میں شامہ، زبان میں گویائی اور ادراک کی مختلف کیفیتیں جسم کے تعلق کے لحاظ سے ایسی ہیں جنھیں نہ متصل کہہ سکتے ہیں اور نہ منفصل اور نہ قریب نہ بعید جس طرح روح کا تعلق جسم سے ہے۔ اس سے زیادہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لامکانی اور بے چوں تعلق انسان کو خدا کی ذات سے ہے :

قرب بے چوں است عقلت را بہ تو ۔۔۔ آں تعلق ہست بے چوں اے عمو

اتصالے بے تکیف بے قیاس ۔۔۔ ہست رب الناس را با جانِ ناس

زانکہ فصل و وصل نبود در رواں ۔۔۔ غیر فصل و وصل نندیشد گماں

ایں تعلق را خرد چوں پے برد ۔۔۔ بستۂ فصل است و وصل است ایں خرد

ماہیتِ ہستی کے متعلق مولانا کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام ہستی خدا سے سرزد ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآن نے خدا کو ھو الاول کہا۔ اور اسی طرح تمام ہستیوں کا منتہیٰ بھی خدا ہی ہے اسی لیے ھو الآخر کہا۔ تمام کائنات میں ایک ارتقائی حرکت ہے۔ کیونکہ خدا سے جو ہستی سرزد ہوئی ہے وہ خدا کی طرف واپس جانے کا میلان رکھتی ہے۔ گویا ہر ذرّے کا رُخ خدا کی طرف پھرا ہوا ہے اور یہی موجودات کی تسبیح ہے۔ یسبح للہ ما فی السّمٰوات وما فی الارض۔ اس تصور کو مرزا غالب نے بھی ایک شعر میں نہایت عمدگی سے ادا کیا ہے کہ خود کائنات انسان کے لیے خدا کی طرف رہبری کا کام دے سکتی ہے۔ اگر انسان یہ دیکھ سکے کہ ذرّوں کا رُخ کس طرف پھرا ہوا ہے :

اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز بہ رہِ تو رُو نیست
در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری

تمام ہستی صدور من اللہ اور عروج الی اللہ ہے کل شی یرجع الی اصلہ تمام ہستی کا ایک کُلّیہ ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں کہ :

ہر کسے کو دُور ماند از اصلِ خویش ۔۔۔ باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

خدا کی طرف رجعت تمام ارتقا کی محرک ہے۔ رومی کے نظریہ کے مطابق کائنات کا مادّی پہلو کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا۔ بے جان اور بے روح مادّہ کائنات کا جوہر نہیں ہے خدا رُوحِ ہستی ہے اور روح سے ارواح ہی صادر ہوتی ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی فلسفۂ اسلام میں اسی نظریہ کو صحیح اور قابلِ قبول قرار دیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ عناصرِ اربعہ مٹی، آگ، ہوا، پانی بھی بے جان نہیں ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند　　با من و تو مردہ با حق زندہ اند

کائنات میں وجود کا ایک لامتناہی تدریجی سلسلہ ہے۔ کوئی ہستی مطلقاً فنا نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اپنے سے اوپر کی ہستی سے رابطہ پیدا کر کے آمادہ بہ ارتقا رہتی ہے۔ انسان کے متعلق فرماتے ہیں کہ موجودہ انسان اسی ارتقا کی ایک کڑی ہے۔ وہ زندہ ذرات سے شروع ہوا اور ارتقا کا ایک قدم اٹھا کر نبات یعنی نشوونما کی منزل میں آیا۔ ایک اور قدم اٹھا کر حیوانیت کے درجے میں پہنچا۔ آگے بڑھا تو انسانیت کے مقام پر متمکن ہوا۔

جس نصب العین آدم کا ذکر قرآن نے کیا ہے وہ یہ موجودہ انسان تو نہیں ہو سکتا۔ یہ لازم ہے کہ انسانیت کی موجودہ منزل کو ارتقا کی آخری منزل قرار نہ دیا جائے۔ آخری منزل تو خدا ہے۔ چونکہ کوئی ہستی مطلقاً خدا نہیں ہو سکتی، اس لیے یہ ارتقا بھی لامتناہی ہوگا۔ بقول اقبال:

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی　　اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

مولانا فرماتے ہیں:

ما بفلک بودہ ایم یارِ ملک بودہ ایم　　ماز ہماں جا رویم خواجہ کہ آں شہر ماست

پھر اسی غزل میں فرماتے ہیں کہ منزلِ ما کبریاست۔

زمانۂ حال میں جرمن فلسفی نطشے نے فوق الانسان (سپرمین) کا ایک تصور پیش کیا اور اس یقین کا اعلان کیا کہ موجودہ انسانیت فوق الانسان کی طرف عبور کرنے کے لیے ایک پُل ہے۔ اس پر سے گزرنا لازمی ہے۔ نطشے نے یہ نظریہ ڈاروِن کی ارتقائی حیاتیات سے بطور نتیجہ حاصل کیا۔ لیکن نطشے کے ہاں روحانیت اور الوہیت کا کوئی تصور نہ تھا۔ اس لیے اس کا Superman ایک Superbeast سے زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔ انسان اس کے نزدیک حیوانوں کی ایک ترقی یافتہ نوع ہے جو تنازع للبقا اور بقائے اصلح کے قانون کے تحت ظہور میں آئی۔ زندگی کے یہی قوانین ایک اعلیٰ تر نوع کو وجود میں لا سکتے ہیں۔ اس کے لیے نطشے یہ لازمی سمجھتا ہے کہ انسان اپنی موجودہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عقل کو خیر باد کہے اور انبیا و اولیا سے حاصل کردہ خصوصاً مسیحی اخلاقیات کو منسوخ قرار دے۔ رحم اور عدل انفعالی کیفیتیں پیدا کرتے ہیں جن سے زبونیٔ ہمت لازم آتی ہے یہ وہی خیال ہے جسے غالب بھی اس شعر میں کہہ گیا ہے :

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال　　حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

نطشے کا فوق الانسان اپنی قوت و قدرت کے اضافے میں کسی دین کا پابند نہ ہوگا۔ اس کی شریعت خود اس کی اپنی فطرت کا نتیجہ ہو گی۔

مولانا روم بھی موجودہ انسان سے بیزار ہیں اور اس سے عبور کر کے آگے بڑھنے کے متمنی ہیں۔ لیکن مولانا کے ہاں یہ ارتقا عقل اور عشق کا ارتقا ہے۔ اس سے قوتوں میں اضافہ ہوگا۔ لیکن یہ اضافہ مزید تزکیۂ نفس سے پیدا ہوگا۔ دیوجانس کلبی یونانی درویش فلسفی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ روزِ روشن میں چراغ لے کر انسانوں کے ہجوم میں پھر رہا تھا۔ لوگوں نے پوچھا کہ بھرے دن کے وقت چراغ لے کر کیا ڈھونڈ رہے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ مجھے تو یہاں اندھیر اور اندھیرا ہی دکھائی دیتا ہے۔ میں اس اندھیرے میں انسان کو تلاش کر رہا ہوں۔ یہ جو آدمیوں کی صورتیں نظر آتی ہیں ان میں کوئی انسان دکھائی نہیں دیتا۔ اسی قصے کو مولانا روم نے ان اشعار میں نظم کیا ہے :

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر　　کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت　　شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتند یافت می نشود جستہ ایم ما　　گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

موجودہ انسانوں کو مولانا سست عناصر کہتے ہیں اور دام و دد کہتے ہیں۔ یہ انسان حقیقت میں حیوانیت سے بھی پوری طرح بلند نہیں ہو سکا۔ قرآنی اصطلاح میں کالانعام بل ھم اضل، کا ایک ہجوم ہے۔ گرتے ہوئے انسان جانوروں سے بہت نیچے گر جاتا ہے۔ کیونکہ جانور تو اپنی جبلتوں کے تقاضے بڑی عمدگی سے پورے کرتے ہیں۔ موجودہ انسان ہستی کی ایک درمیانی منزل میں ہے۔ اگر اوپر اٹھے تو فرشتوں سے بلند تر ہو سکتا ہے اور نیچے گرے تو حیوانیت سے بھی اسفل درجے میں گرتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آدمی زادہ طرفہ معجونیست … از فرشتہ سرشتہ وز حیواں
گر کند میل ایں شود بدازیں … ور کند قصدِ آں شود بہ ازاں

فرماتے ہیں کہ میں نے زندہ ذرات سے زندگی شروع کی اور لاکھوں برس ارتقا کی اس منزل میں گزارے :

صد ہزاراں سال بودم در مطار … ہمچوں ذراتِ ہوا بے اختیار

یہ وہ حالت تھی جسے جمادات کہتے ہیں لیکن جمادات میں بھی جبرِ محض نہیں تھا۔ میلانِ ارتقا اضطراب آفریں تھا اس لیے میں اس حالت میں سے آخر تڑپ کر نکل گیا۔ موت اور فنا کوئی چیز نہیں۔ ارتقا کے عمل میں ہر فنا بقا کا اور ہر موت نئی زندگی کا سرچشمہ بنتی ہے :

از جمادی مردم و نامی شدم … وز نما مردم بحیواں سر زدم
مردم از حیوانی و آدم شدم … پس چہ ترسم کے ز مردن کم شوم
حملہ دیگر بمیرم از بشر … پس بر آرم از ملائک بال و پر
بارِ دیگر از ملک پراں شوم … آنچہ اندر وہم نا ید آں شوم
پس عدم گردم عدم چوں ارغنوں … گویدم کانا الیہ راجعون

جو جذبۂ حیات ہر وجود کو قائم رکھتا اور اس کو اوپر کی طرف ترقی دیتا ہے اس کو مولانا عشق کہتے ہیں۔ عشق وہ کیفیت ہے جس میں اعلیٰ ادنیٰ کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور ادنیٰ اعلیٰ کی طرف فطرتاً کھنچتا اور اس میں جذب ہونے پر مائل ہوتا ہے۔ ہر درجۂ حیات کے ساتھ شعور کا ایک درجہ وابستہ ہے لہٰذا کوئی ہستی عشق میں جس درجے تک پہنچی ہے، اسی قدر اس کے شعور میں بھی ترقی ہوتی ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ عشق انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان لازماً ہر عشق میں عقل و ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عشق کی فراوانی میں عاشق کو محبوب کے سوا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ اس کی توجہ ہر غیر متعلق چیز سے ہٹ جاتی ہے۔ گویا وہ اشیا اس کے لیے موجود ہی نہیں رہتیں۔ لیکن اپنے سے اعلیٰ تر ہستی کا عشق ہو تو یہ عشق اپنی یکسوئی کی وجہ سے بصیرت آفریں ہو جاتا ہے۔ عشق کی ترقی عرفان کی ترقی کے مرادف ہو جاتی ہے اور یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دونو پہلو بدوش ترقی کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ فانی چیزوں کا عشق بھی فانی ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا عشق اس ہستی کا اختیار کرو جو باقی رہنے والی ہے:

عشق آں زندہ گزیں کو باقی است وز شراب جانفزائت ساقی است

فرماتے ہیں کہ انسان عالم کی اشیا اور اعراض سے عشق کرتا ہے۔ حالانکہ اشیا اور اعراض خود مستقل حقیقت نہیں، بلکہ حقیقت کا سایہ ہیں۔ اصل حقیقت دل یا روح ہے جو ایک جوہر ہے:

پس بود دل جوہر و عالم عرض سایۂ دل چوں بود دل را عرض

زندگی کے تمام اعراض محض صورتیں ہیں جو فکر سے پیدا ہوتی ہیں اور ان کا تعلق دل سے ہے:

ایں عرض ہا از چہ زاید از صُوَرویں صور ہا از چہ زاید از فکر

انسان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ اس کو اپنے مبدا و منتہٰی کا عرفان حاصل ہو جائے عرفانِ نفس اور عرفانِ رب ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ جمادات و نباتات و حیوانات بھی بالکل محروم عرفان نہیں ہیں۔ لیکن ان میں عرفان و شعور کے ادنیٰ مدارج ملتے ہیں۔ عام انسان عقل کے ایک درجے تک پہنچے ہیں۔ جو عقلِ حیوانی سے بالاتر ہے لیکن نہ موجودہ انسان ارتقا کی آخری کڑی ہے اور نہ اس کی موجودہ عقلِ معاش اور عقلِ علوم و فنون عقل کی آخری منزل ہے۔ انبیا اور اولیا میں جو عقل ہوتی ہے وہ عقلِ حسّی اور عقلِ استدلالی سے بالاتر شعور کی کیفیت ہے۔ ارتقا کا یہ قدم بہت کم افراد اٹھا سکے لیکن ان چند افراد کے تجربات سے انسان کو یہ رہنمائی مل سکتی ہے کہ آگے راستہ کس طرف جاتا ہے۔ روحِ نبوی اور عام انسانی روح میں اس قدر فرق پیدا ہو جاتا ہے جس قدر روحِ حیوانی اور رُوحِ انسانی میں، پھر آگے ولایت و نبوت کے بھی مدارج ہیں جن کا اندازہ کرنا اس شخص کے لیے محال ہے جو عقلِ استدلالی سے آگے ترقی نہیں کر سکتا:

باز غیر از عقل و جانِ آدمی! ہست جانے در نبی و در ولی

روح وحی از عقل پنہاں تر بود زانکہ او غیب است و او زاں سر بود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا کا عقیدہ ہے کہ یہ ترقی محض خارجی فطرت کے علم اور استدلال سے نہیں ہوتی۔ اس کے لیے تزکیۂ نفس اور عشق ہی کا راستہ ہے۔ اس طریقے سے ان حقایق کا انکشاف ہوتا ہے جہاں تک حواس و عقلِ جزوی کی رسائی نہیں:

آئنۂ دل چوں شود صافی و پاک — نقش ہا بینی بروں از آب و خاک

پس بدانی چوں کہ رستی از بدن — گوش و بینی چشم مے تاند شدن

پس محلِ وحی گردد گوشِ جان — وحی چہ بود؟ گفتن از حسِ نہاں

از پئے روپوش عامہ در بیان — وحی دل گویند او را صوفیان

اب انسان کی آگے کی منزل یہ ہے کہ وہ عقلِ استدلالی سے بڑھ کر محل وحی بننے کی کوشش کرے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ علوم و فنون کی ترقی بھی ایک قسم کی وحی ہی سے ہوتی ہے۔ بڑے بڑے انقلابی انکشافات محض تجربے اور استدلال سے پیدا نہیں ہوئے:

این نجوم و طب وحیِ انبیا است — عقل و حس را سوئے بے سو رہ کجاست

مولانا کے نزدیک ولایت و نبوت انسان کو ارتقا کی آنے والی منزل کا پتہ دیتی ہیں۔ مادی فطرت کے قوانین اور اس کے ذریعے سے خارجی فطرت کی تسخیر انسان کا منتہیٰ نہیں بلکہ سرِ راہ تھوڑی دیر رکنے اور دم لینے کا ایک ٹھکانا ہے۔

ہندوستان کا مشہور دینی ماہنامہ

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۴ء سے نکل رہا ہے

بانی و مدیر
مولانا محمد منظور نعمانی

مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

اپنے قارئین کو دین کے صحیح فہم میں مدد دیتا ہے! ــــــ اس کے مضامین ذوقِ عمل اور روحانی گداز بخشتے ہیں!! ــــــ اس کے ذریعہ ہر مہینے اپنے دینی فکر اور دینی حالت کا جائزہ لیا جا سکتا ہے!!! اور ــــــ جن لوگوں کو ملی مسائل پر حقیقت پسندانہ غور و فکر سے دلچسپی ہے وہ اس میں اپنی اس دلچسپی کا ــــــ بھرپور سامان بھی پا سکتے ہیں

سالانہ: ۵۰/۷
ششماہی: ۴/-

پورے واقفیت کے لیے نمونہ مفت طلب فرمائیے

غیر ممالک سے ۲۵ شلنگ

منیجر رسالہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

پاکستان ... بلڈنگ، لاہور

© rasailojaraid.com